OPEN ACCESS: Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
ISSN (ONLINE): 2707-1219 & ISSN (PRINT): 2707-1200
http://www.arjish.com

انتظار حسین کے افسانوں میں اسلامی و تاریخی شعور

Historical and Islamic Consciousness in the Stories of Intezar Hussain

Syed Shahzaib Iqbal
M.Phil Scholar in Urdu, Ghazi University, D.G Khan.
Email: syedshahzabiqbal247@gmail.com

Hamza Ameen
M.Phil Scholar in Urdu, Ghazi University, D.G Khan.
Email: hamzamalikdgkhan@gmail.com

Muhammad Zeeshan Akram
M.Phil Scholar in Urdu, Ghazi University, D.G Khan.
Emai: zeeshanleghari65@gmail.com

Received on: 03-07-2025 Accepted on: 04-08-2025

Abstract

Intezar Hussain is considered one of the prominent short story writers who made a significant effort to highlight historical and Islamic consciousness in his stories. In short story writing, several new personal experiences were experimented with. New techniques and innovations in storytelling created a sensation around Intizar Hussain in the realm of fiction. He was gifted to the readers as a result of migration. Intizar Hussain wrote his stories with the ink of his heart's blood. Rather than merely writing stories, he seems more like a storyteller who narrates them. This article explores his historical style of Intezar Hussain who had a great place in the literary world.

Keywords: Intizar, Historical, Writings, Consciousness, Migrations,

موضوع پر گفتگو

تاریخ انسانوں کی لغزشوں کا حصہ ہے جس کے ذریعے ماضی میں کی گئی کوتاہیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے اور اپنے مشاہیر (بزرگوں) کی خامیوں اور دشمن کی چالاکیوں سے آگاہی حاصل کی جاتی ہے۔ تمدن میں ترقی و تنزلی کے اسباب پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔ یہ باشعور قوموں کی عادت ہے کہ وہ ہر آن اپنا محاسبہ تاریخ کے پس منظر میں کرتی ہے۔14۔ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندو مسلم فسادات اور سکھ مسلم نزاعات کا سلسلہ شروع ہوا تھا لیکن قیام پاکستان کے ساتھ ہی ہندو مسلم نقل مکانی کی وجہ سے فسادات پر بھڑک اٹھے۔ یہ دنیائے عالم کی تاریخ میں سب سے بڑی نقل مکانی تھی لوگ اپنے اثاثے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ انسان انسان نہ رہے، درندوں اور حیوانوں کی طرح ایک دوسرے کو اس وقت کے افسانوں کے موضوع اور حالات و واقعات وہ تھے جو ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں افسانہ نگاروں کے ہاں فرد کا تصور زیادہ ابھر کر سامنے آیا اور افسانہ نگاری میں کئی ایک نئی ہستیوں کے تجربے کیے گئے نئی تکنیک اور نئے تجربوں نے افسانہ نگاری کے

درمیان انتظار حسین کا تہلکہ مچادیا۔ وہ ہجرت کے ایک تحفے کے طور پر قارئین کو ملے۔ انتظار حسین نے خون دل سے کہانیاں لکھی ہیں وہ کہانی لکھنے کی بجائے کہانی سنانے والے زیادہ لگتے ہیں حالانکہ وہ اشفاق احمد کی طرح زبانی قصہ گوئی نہ کرتے تھے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں میں تاریخ و تہذیب کے ہلکے پھلکے مغرب پر طنز ملتے ہیں۔ اور اپنی تہذیب کی عظمت کا تصور ابھرتا ہے۔

انتظار حسین غالباً اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں پاکستانی قوم اور پاکستانی فرد کی انفرادیت اور شخصیت کی شناخت کی کوشش کی ہے۔ انتظار حسین کا شمار اردو کے رجحان ساز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے علامتی واساطیری افسانے کے سفر میں تہذیبی شعور سے روشنی حاصل کر کے اس صنف کو نئے امکانات سے روشناس کیا۔ انتظار حسین کے افسانوی مجموعوں میں گلی کوچے، کنکری، آخری آدمی، شہر افسوس، کچھوے، اور خالی پنجرہ کو اردو افسانوی ادب میں وقار اور اعتبار حاصل ہے اور پاکستانی افسانے کی شناخت متعین کرتے ہوئے انتظار حسین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انتظار حسین کا اسلوب ان کی اپنی تخلیق ہے جو انہوں نے روایت وجدت کے میل جول سے بنائی ہے۔ وہ کردار سے کم اور فضاء سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی کہانیوں میں فطری عناصر بھی کرداروں کے ہم پلہ کردار نظر آتے ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے تخیل اور فکر کو زمین سے باندھ رکھتے ہیں۔ وہ حافظے کو کم نہیں ہونے دیتے۔ ماضی کھو جائے تو انسان مکمل ہوتے ہوئے بھی ادھورا رہتا ہے۔ اس لیے ان کے افسانے لاشعور کو سونے نہیں دیتے۔ الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں؟) کے جواب میں قالو بلیٰ (بے شک تو ہی ہمارا رب ہے) والے جواب سے شروع ہونے والی زندگی، ماں کے پیٹ والے چند ماہ ابتدائی دوڈھائی سال جس طرح شعور کی گرفت سے باہر ہیں مگر لاشعور کی آنچ سے حدت پاسکتے ہیں۔ انسان اپنی اجتماعی تاریخ و تہذیب سے بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ " قیوما کی دکان " سے لے کر تادم آخر انتظار حسین کا فنی نقطہ نظر ادھر اُدھر نہیں ہوا۔ انگریزوں کے ہندوستان میں داخلے کے وقت کو انتظار نے روحانی بکھراؤ کے طور پر لیا ہے۔ ان کو تقسیم کی واردات نے سامراجیت کو سمجھنے میں مدد دی۔ وہ افسانہ نگار ہوتے ہوئے بھی میر انیس، نظیر اکبر آبادی، اور مولانا محمد حسین آزاد سے متاثر ہیں۔ میر انیس کے پاس مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ موجود تھا۔ نظیر نے ارضی رشتے کو انسان کی رفعتوں کا ذریعہ جانا اور آزادی کی انفرادیت ان کا طرز احساس ہے جو تاریخ و تہذیب کے بارے میں تھا۔ یہ خالی بیان نہیں تھا بلکہ انتظار میں کے فنی سفر میں ان کی تینوں شخصیات کے اثرات نمایاں ہیں۔

انتظار حسین نے کربلا کو تخلیقی تجربے میں لا کر نیا کنارہ ڈھونڈا اور شاید یہیں سے وہ بائبل کی طرف متوجہ ہوئے۔ جہاں بنی اسرائیل کے کتنے ہی واقعات کربلا سے مشابہہ نظر آتے ہیں:

"بخت نصر نے یروشلم کو برباد کیا۔ وہ بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے کے بابل لے گیا۔ جہاں وہ پچاس سال تک مصیبتیں جھیلتے رہے۔ ان کی زبان پر یہ گیت رہتے، ہم بابل کے

دریاؤں کے کنارے بیٹھ کر میونوں کو یاد کرتے اور روتے ہیں۔"(1)

افسانوں میں دردمندی اور احساس ندامت کی شدت کو ظاہر کرنے کے لیے اس طرح کے تجربات اردو فکشن کو باوقار بناتے ہیں۔ میر انیس اور

انتظار حسین کے اس رشتے کے متعلق گوپی چند لکھتے ہیں: "فکشن میں قراۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے فن کو اس وقت تک سمجھا ہی نہیں جا سکتا جب تک اس تخلیقی سائیکی کو نظر میں نہ رکھا جائے جو روایت میں یہ نشین تو تھی لیکن جس کی دردمندی کو ادب کی آفاقی دردمندی کی دولت انہیں نے دی اور اسے ادبی تخلیقی روایت کا زندہ دھڑکتا ہوا حصہ بنا دیا۔"(۲)

سقوط دلی اور تقسیم ہند کو ادب میں موضوع بنایا گیا تو افسانوی ادب میں ان کو سطحی انداز میں لیا گیا۔ یہ وہ دور ہے جب اُردو افسانہ اپنے کلاسیکی دور میں تھا مگر ان فنکاروں کی اکثریت نے تقسیم کو ایک حادثہ سمجھا۔ سامراج کی سازش، سیاسی تقسیم، اخلاقی زوال کے تناظرات ہی کہانیوں میں ابھرے۔ اس تہذیبی بکھراؤ کو گویا سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ انتظار حسین نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور تخلیق کو نیا موڑ دیا۔ ہجرت کے تجربے کو عام انسان کے ذریعہ سے بیان کیا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کے فن میں پختگی آئی اور انہوں نے بنیادی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کی جو تہذیبی بکھراؤ کا سبب بنیں۔ انسان نیکی اور بدی کی جنگ ازل سے لڑ رہا ہے اور تاریخ سے یہ ثابت شدہ ہے کہ بدی کا پلڑا بھاری چلا آرہا ہے۔ اتنا بھاری کہ بدی اور نیکی گڈمڈ بھی ہوئی اور کئی مرتبہ بدی اور نیکی اپنے مقام ادل بدل کرتھیں۔ ڈاکٹر صادق علی لکھتے ہیں:

"نفس پرستی، مادیت اور تنگ نظری قدیم ہندوستانی کلچر کے لیے زہر قاتل ثابت ہوئی۔ انہوں نے نوآبادیاتی نظام کی آمد کو برائیوں کا آغاز قرار دیا۔ یہاں کے باسیوں کا اپنی زمین کے ساتھ رشتہ کیا تھا؟ اور بعد میں اس رشتے کی نوعیت کیا ہو گئی؟ یہ سوال انتظار حسین نے شدت سے اٹھایا۔ افسانے کا مقصد معاشرتی مظاہر کے ساتھ ساتھ اس کے باطن میں جھانکنا اس لیے مناسب سمجھا ہے کہ حاضر حقائق کی حقیقت بجا لیکن غائب کی دنیا کا وجود بھی سچ ہے۔ انسانی افکار اور حوادث کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ تاریخ ہے"۔(۳)

انتظار حسین نے تاریخ سے مدد لی ہے۔ مٹی سے انسانی رشتے کی نوعیت کیا ہے اس لیے انہوں نے تاریخ کے بڑے بڑے واقعات کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً ہجرت مدینہ، ہجرت کوفہ و کربلا، بنی اسرائیل کی ہجرت، طوفان نوح کے نتیجے میں ہجرت وغیرہ۔ ڈاکٹر گستاولی بان لکھتے ہیں: کہانیوں اور قصوں میں تو ہندوستان بہت ہی بڑھا چڑھا ہوا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ کل تاریخی اور مذہبی لٹریچر انہیں قصوں اور دکانتیوں سے بھرا ہوا ہے۔"(۴)

بیسویں صدی کو عام طور پر تباہیوں اور بربادیوں کے حوالے سے جانا جاتا ہے مگر اس صدی کو نعروں، تقریروں اور خطیبوں اور مداریوں کی صدی بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے اثرات براہ راست انسان کی ذات پر پڑے جو بعد میں اجتماعی سوچ کی صورت ابھرے۔ عقل و خرد کی بجائے جوش و جنون کا ڈنکا بجنے لگا۔ تعصب کی وہ آگ بھڑکائی گئی کہ انسان انسانیت کے مقام سے ناآشنا ہو گیا۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے قوتوں کو تحریک دینے کی سعی کی ہے۔ تاریخ کا دھارا جس سمت نہج پر بیسیویں صدی کے نصف آخر میں چلا اس سے یہ ثابت ہوا کہ آدمی نعروں کے سحر میں قریب کو حقیقت سمجھ بیٹھا، وہ سیڑھیاں چڑھ تو رہا ہے مگر وہ بلندی کی بجائے اندھیرے کنویں کی سیڑھیاں اترتا چلا جاتا ہے۔ بقول انتظار حسین:

"آدمی۔۔۔۔ الومارشی نے حقارت سے کہا، آدمی تو مور کھ ہے، اسے اپنے چھل ٹھیٹ، اپنے لڑنے مرنے سے فرصت نہیں۔ اسے کیا انعام ملے گا۔ اور وہ کسی کو کیا انعام دے گا(۵)

برصغیر کی سماجی اور سیاسی تاریخ کو مختص خارجی سطح پر پرکھا جاتا رہا ہے کہ ان کی روح میں جھانک کر دیکھا جائے کہ حالات کے جبر کا فلسفہ کیا ہے۔ ۱۸۵۷ سے ۱۹۷۱ تک تاریخ کے ہر بڑے واقعے نے انہیں یقین دلوایا کہ سفر تنزلی کا ہے جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ مسلمانوں کی تاریخ اور برصغیر کی تاریخ میں جو مماثلتیں ہیں ان میں ایک مشترکہ نکتہ ہے۔ سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کو آلہ کار منتخب کیا گیا۔ جس نے سماج کو منافرت (دوری) کی راہ پر ڈالا۔ خود پسندی اور دوسروں کو راندہ درگاہ (گناہ گار) قرار دینا سامی مذاہب کی روایت ہے۔ انتظار حسین نے مذہب اور غیر مذہب کے فرق پر سوال اٹھایا ہے۔ انہوں نے جدید تعلیم یافتہ انسان اور ان پڑھ کسان کا تقابل کر کے کچھ پوچھا ہے۔ بقول انتظار حسین:

"تعلیم یافتہ وہ سند یافتہ نوجوان ہے۔ جس نے جمیز جینز کا جملہ تصانیف پڑھی ہیں مگر آسمان پر کھلے تاروں کو دیکھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ مشتری کون سا ستارہ ہے یا تعلیم یافتہ وہ ان پڑھ ہے جو تاروں کو دیکھ کر یہ بتا سکتا ہے کتنی رات ہو گئی ہے۔"(1)

افسانہ سماج اور معاشرت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انتظار حسین کے افسانوی کردار زیادہ تر مسلمان ہیں اور کہانیوں میں اجتماعی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔ تقسیم کے بعد جس صورت حال نے جنم لیا اس میں کہانی کار کا پورا سماج اندھیروں میں بھٹکتا دکھائی دیتا ہے۔ سمت کا تعین سرے سے کیا ہی نہیں گیا، سفر کے دوران آندھیوں نے آلیا۔ دور اندیشی کے فقدان کا ذمہ دار کون ہے؟ تبدیلی بکھراو کا گنہگار کون ہے؟ پھر سماج کے اندر مسلسل توڑ پھوڑ جو ہوتی چلی جا رہی ہے یہ کیوں ہے؟ یہ سوال گہرے تاریخی شعور کے متقاضی ہیں۔ انہی سوالات کو انتظار حسین کے افسانوں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انتظار حسین نے موضوعاتی اور اسلوبیاتی ہر لحاظ سے افسانے کو نئے تجربات سے متعارف کروایا۔ اپنے زمانے کے فتنہ و فساد کو انہوں نے کہانی کا مرکزی سروکار بنا کر پیش کیا ہے۔ افسانہ نگار کی اپنی قوم جس ڈگر پر چلی یا چلائی گئی اس سے عقائد اور نظریات کے مباحث نے جنم لیا۔ تشدد عدم برداشت اور انتہا پسندانہ سوچ جب اس کے نتیجے میں سماج کے اندر آئے تو انہوں نے اپنی روایت سے استفادہ کیا۔ قدیم کہانیوں اور تاریخی واقعات کو حال پر مسلک کرنے کے پیچھے مقصد جو کارفرما نظر آتا ہے وہ تہذیبی معنویت سے آشنائی ہے۔ انتظار حسین نے روایت سے جو تعلق کا ڈول ڈالا اس سے افسانے کی ہیئت پر کہیں بھی سمجھوتہ نہیں ہوا۔ ان کی ہر کہانی میں جدید افسانے کے سب لوازمات موجود ہیں۔ انتظار حسین نے تقسیم ملک اور قیام پاکستان کو ہجرت کا تجربہ اور باطنی واردات کہا ہے۔ انتظار حسین کے مطابق اس دوران انسانی ہجرت اس طرح سے ہوئی ایک ذہنی اور دوسری جسمانی، جو لوگ ہجرت کر کے پاکستان گئے تھے۔ انھیں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے ہجرت کے درد کو جھیلنا پڑا۔ انتظار حسین ان میں سے ایک ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی، انتظار حسین کے ہجرت کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ ہے کہ انتظار حسین کا بنیادی تجربہ ہجرت کا ہے۔ ہجرت اس معنی میں نہیں کہ کچھ افراد ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ چلے گئے بلکہ وہ ہجرت کو ایک داخلی اور روحانی تجربے کے طور پر محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے واردات کا لفظ خاص طور پر استعمال کیا ہے اور بعض انٹرویو میں یہ واضح کیا ہے کہ دراصل واردات تجربے سے ہم آہنگ ہے اور یہ تجربہ انھیں ہجرت کے پس منظر میں حاصل ہوتا رہا ہے۔ دراصل ان کے تصور میں ہجرت کا ڈانڈ ور سول کریم کے ہجرت کے روحانی تصور سے ملتا ہے۔ جسکا مقصد بالکل الگ ہے۔ لہذا ان کے افسانے ہوں یا ناول دراصل ہجرت کا المیہ تجربے کی ایک ایسی کیفیت سے عبارت ہے جو تخلیق کی سطح پر آکر تطہیر کا کام سرانجام دیتی ہے"(4)۔

ہجرت اور ماضی کی یادیں ان کے افسانوں میں ساتھ ساتھ ملتی ہیں۔ نہ صرف ہجرت اور یادِ ماضی قدیم روایات و رسومات اور تہذیب کو بھی جابجا بیان کرتے رہتے ہیں۔ ان کے لیے ماضی مطلب تقسیم سے قبل کا ہندوستان ہے اور ہندوستان کے معنی ہندو اور مسلمان ہیں۔ اکثر افسانوں میں دونوں سے ہی شناسائی ملتی ہے۔ بقول انتظار حسین:

"ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے بڑا شور مچایا کہ شجاعت علی اس جوش سے داستان سنائے جا رہے تھے۔ پیروں فقیروں کے مزار ہیں۔"(۸)

ہندوستانی تہذیب میں یہ شامل ہے کہ ہر ایک گھر کا ایک مخصوص لکھیا ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں پورے گھر کی باگ ڈور ہونے سے گھر کا وجود قائم رہتا ہے مگر آج کے سائنسی اور صنعتی دور میں یہ خصوصیت کم ہو کر رہ گئی ہے۔ انتظار حسین "محل والے" میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ بقول انتظار حسین:

"اعیاد یکھا گیا ہے کہ کبھی کبھی خاندان کا بھرم کسی ایک شخصیت کی وجہ سے بنا رہتا ہے۔ اس کے اٹھتے ہی ساتھ ایسی بگڑتی ہے کہ بنے میں پھر آتی ہی نہیں۔ محل والوں کے ساتھ یہی ہوا ہے بیج صاحب نے اپنی زندگی میں خاندان والوں کو ایسا جمائے رکھا تھا کہ نہ تو کسی مفلسی کا دور آیا اور نہ آپس میں کوئی تفرقہ پیدا ہوا۔ ان کی آنکھ بند ہونے ہی سارا خاندان تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔"(۹)

انتظار حسین اپنے افسانوں میں ماضی میں جا کر وہاں کے میلوں ٹھیلوں، مندروں، مسجدوں، مزاروں وغیرہ اور وہاں کی تہذیب کو بھی یاد کرتے ہیں۔ جو کہ معاصر عہد میں ملکی تقسیم کے بعد ملتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے محل والے افسانے میں ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے ایک اعلیٰ خاندان کے لوگ پاکستان میں آکر شروع شروع میں ایک جگہ مل جل کر رہتے ہیں یہ سوچ کر کہیں خاندان منتشر نہ ہو جائے مگر آخر میں ان میں پیار و محبت اور اتفاق قائم نہیں رہتا اور ایک دن نفرت انہیں الگ الگ ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ محمد حسن:

"انتظار حسین نے تقسیم ہند کے بعد مسلمان متوسط طبقے کے قصباتی کلچر پر آنسو بہائے ہیں۔ اجڑے ہوئے امام باڑوں اور ویران حویلیوں کی فریاد کچھ اس انداز سے سنی ہے جس طرح سعدی نے بغداد کے در و دیوار کی شوکت کا نوحہ سنا تھا۔"(۱۰)

انتظار حسین نے اپنے افسانے میں آخری آدمی، بندر، بنت الاخفر اور لفظ جیسی علامتوں کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ "کایا کلپ" اور "زرد کتا" میں بھی انسانی و معاشرتی زوال کو مکھی اور کتے کی علامتوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ افسانہ "شہر افسوس" میں انہوں نے ایک ساتھ کئی موضوعات کا علامتوں کے ذریعے اظہار کیا ہے۔ ہجرت انسانی پہچان و شناخت یاد ماضی، معاشرتی زوال وغیرہ کو یکجا کر کے افسانہ لکھا ہے۔

انتظار حسین کے ان افسانوں میں ہمیں تاریخ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

آخری آدمی

آخری آدمی انتظار حسین کے نمائندہ افسانوں میں شامل ہے۔ قصص القرآن میں مذکور ہے کہ بعض قوموں کی گمراہی اور نافرمانی کے باعث اللہ تعالیٰ نے انہیں نمونہ عبرت بنا دیا۔ سورۃ البقرہ اور سورۃ الاعراف میں بنی اسرائیل کی نافرمانی اور سرکشی اور اس کے نتیجے میں قہر الٰہی کا ذکر ملتا ہے۔ انتظار حسین اس افسانے میں یوں تحریر کرتے ہیں:

ترجمہ:

"پھر تمہیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ تو معلوم ہی ہے۔ جنہوں نے سبت کا قانون توڑ دیا۔ ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر بن جاو! اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر

دھتکار پڑے۔"(11)

انتظار حسین نے مذکور واقع کی روشنی میں افسانے کا تانا بانا تیار کرتے ہوئے اسے جدید دور کے مادیت پرست طبقے پر منطبق کر دیا ہے۔ زر کی ہوس نے جس طرح آدمی سے اس اس کی آدمیت چھین کر اسے اعلیٰ اخلاقی قدروں سے محروم کر دیا ہے اور وہ جس طرح اس کی جون تبدیل کر دی ہے، اس کے تناظر میں، افسانہ کسی خاص عہد یا معاشرت تک محدود نہیں رہتا بلکہ آفاقیت کا حامل ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین رقم طراز ہیں:

دہشت سے صورتیں ان کی چپٹی ہونے لگیں اور خد و خال مسخ ہوتے چلے گئے اور الیاسف نے گھوم کر دیکھا اور بندروں کے سوا کسی کو نہ پایا۔"(۱۲)

افسانے کا مزاج علامتی استعاراتی ہے۔ افسانے کا مرکزی خیال قصص القرآن سے ماخوذ ہے اور آخری آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔

افسانے کی کہانی بنیادی طور پر انسانی ہوس کی کہانی ہے، بعض افراد احکام الہی کی نافرمانی کرتے ہوئے مختلف حیلوں اور بہانوں سے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیت کا کھوٹ، اعمال کو منفی بنا کر انسان کی بنیادی کیمسٹری تبدیل کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیک اور صالح افراد کا چہرہ ان کے باطن کا آئینہ بن کر ان شخصیت کے گرد ایک ہالہ بن جاتا ہے اور منافقت ریاکاری اور بدکاری، آدم زاد کی شخصیت کا لازمی حصہ بن کر اسے اس کے وجود خاص طور پر اس کی آنکھوں میں محبت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

سب سے پہلے الیعذر بندر بن جاتا ہے کیونکہ اس نے سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑلی تھیں۔ پھر ایک نے دوسرے کو الیعذر کے بندر بن جانے کی خبر دی تو وہ سننے والا ہنسا اور ہنستے چلا گیا کہ عالم حیرت میں بندر بن گیا۔ انتظار حسین رقم طراز ہیں:

"لوگوں نے اس کا برا مانا اور کہا کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔"(۱۳)

افسانے کا مرکزی کردار الیاسف ہے۔ یہ دانشمند اور صاحب شعور ہے۔ وہ یوم السبت کو شکار، تجارت اور دوسری سماجی سرگرمیوں پر اللہ تعالی کی طرف سے عائد کی جانے والی پابندی کے پس منظر میں چھپی مصلحت اور حکمت کا ادراک رکھتا ہے۔ وہ اپنے قبیلے کے مختلف افراد کو حرص و ہوس اور لالچ کے ہاتھوں مجبور ہو کر احکام الہی کے خلاف ورزی کرنے اور اس کے نتیجے میں آدمی سے بندر بنتا ہوا دیکھتا ہے تو اپنے آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ لالچ اور حرص سے مغلوب ہو کر آدمیت کے مرتبے سے نہیں گرے گا۔ انتظار حسین رقم طراز ہیں:

"الیاس اس قریے میں آخری آدمی تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور میں آدمی ہی کی جون میں مروں گا۔ اور اس نے آدمی کی جون میں رہنے کی آخر دم تک کوشش کی۔"(۱۴)

لیکن آخر کار اس کی عقل ہی اسے فریب دیتی ہے۔ چنانچہ وہ صریح خلاف ورزی کی بجائے مکر، حیلے اور خود فریبی کا سہارا لیتا ہے۔ وہ ہفتے کے روز ،سمندر کے قریب ایک گڑھا کھود کر اس گڑھے کو سمندر سے ملا دیتا ہے۔ سمندر کی لہریں بہت سی مچھلیوں کو اس گڑھے میں بند کر دیتا ہے اور وہ اگلے روز بہت آسانی سے ان مچھلیوں کا شکار کرتا ہے اور حاصل ہونے والی آمدنی کو اپنی عقلمندی سمجھتا ہے۔ انتظار حسین رقم طراز ہیں:

"جیسے اس کی آواز بدلتی جارہی ہو اور الیاسف نے اپنی بدلتی ہوئی آواز پر غور کیا اور زبلون اور الیاب کو یاد کیا کہ کیوں کر ان کی آوازیں بگڑتی چلی گئی تھیں۔ الیاسف اپنی بدلتی ہوئی آواز کا تصور کر کے ڈرا اور سوچا کہ اے معبود کیا میں بدل گیا ہوں اور اس وقت اسے یہ نرالا خیال سوجھا کہ اے کاش کوئی ایسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعے وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا۔ مگر یہ خیال اسے بہت انہونا نظر آیا۔ اور اس نے درد سے کہا کہ اے معبود میں کیسے جانوں کہ میں نہیں بدلا ہوں۔"(۱۵)

الیاسف کے آدمی سے بندر بننے کے دو اسباب ہیں۔ پہلا ذاتی ہے، جس کے باعث اس کے باطن میں پنپنے والے منفی جذبات اس کی شخصیت کو توازن سے محروم کر دیتے ہیں جبکہ دوسری وجہ سماجی ہے جس کے باعث مادیت پرستی کا زہر سماجی اقدار کے وجود میں سرایت کر جاتا ہے اور فرد سماجی تفاعل سے محروم ہو کر رشتوں کی شکست و ریخت کا مشاہدہ کرتا ہے، جہاں ابلاغ کا عمل اس قدر سے بے وقعت ہو جاتا ہے کہ لفظوں کی موت ہو جاتی ہے۔ انسان کا بندر بن جانا جا ایک بڑا سانحہ تھا، جس کے نتیجے میں انسان شعور و آگہی کے تمام ثمرات سے محروم ہو گیا۔ افسانے کی انفرادیت کا ایک اہم سبب اس کا اسلوب ہے، مصنف نے شعوری طور پر کرداروں کے ناموں، فضا بندی اور صورت واقعہ کی تشکیل میں قدیم عرب کی فصاحت و بلاغت کو پیش نظر رکھا ہے۔ انتظار حسین کے فن کا بنیادی جوہر یہ ہے کہ وہ تاریخ و تہذیب کے پراسرار اور پیچیدہ جنگل میں اتر کر اظہار و ابلاغ کے علامتی وسیلے کو معتبر بناتا ہے۔ مجموعی طور پر آخری آدمی "نہ صرف انتظار حسین کا بلکہ اردو کا بھی ایک شاہکار افسانہ ہے، جس میں مصنف نے اپنی فکری و فنی بصیرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے آدمی کی جگوں پر محیط کہانی کا استعارہ بنا دیا ہے آخری آدمی انتظار حسین کا غیر معمولی افسانہ ہے جس میں انہوں نے اچھوتے اسلوب بیان میں انسان کی اخلاقی اقدار کی تخریب، روحانی کشمکش اور اس پر جبلی قوتوں کے غلبے کو موثر انداز میں بیان کیا۔

زرد کتا:

افسانہ زرد کتا انتظار حسین کی ایک شاہکار کہانی ہے۔ اس میں عہد نامہ قدیم کی زبان سے استفادہ کیا گیا ہے اور بزرگان دین کے ملفوظات اور داستان کی زبان کا نیا تخلیقی استعمال ملتا ہے۔

انتظار حسین اس افسانے میں یوں تحریر کرتے ہیں:

"جب آپ یہ واقعہ بیان فرما چکے تھے تو میں نے سوال کیا، یا شیخ الومڑی کے بچہ کا رمز کیا ہے اور اس کے روندے جانے سے بڑے ہونے میں

کیا بھید مخفی ہے؟تب شیخ عثمان کبوتر نے ارشاد فرمایا کہ لومڑی کا بچہ تیرا نفس امارہ ہے۔ تیرا نفس امارہ جتنا روندا جائے"

اس افسانے میں انتظار حسین نے بتایا ہے کہ جب برائی وبا کی طرح ہر طرف پھیل جاتی ہے تب انسان چاہے بھی تو اس کی زد سے بچ نہیں سکتا۔ یہ ہوس دیہاتی، شہری، امیر غریب غرض ہر شخص کے وجود میں رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی مانند رچ بس گیا ہے۔ جس کے لیے زرد کتے کا استعارہ بہت موزوں نظر آتا ہے۔ یہ ہوس اگر ختم نہ ہوئی تو اس کا انجام لاموجود کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ کیونکہ جب آدمی اور زرد کتے کا آپس میں تصادم ہوتا ہے تو جیت زرد کتے ہی کی ہوتی ہے جو انسان کے روحانی پستی کا سبب بنتا ہے۔ انتظار حسین رقم طراز ہیں:

"شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں تیسرا فاقہ تھا، ان کی زوجہ سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے شکایت کی۔ تب شیخ ابو سعید باہر نکلے اور سوال کیا۔ سوال پر جو انہوں نے پایا وہ لے کر اٹھتے تھے کہ کوتوالی والوں نے انہیں جیب تراشی کے جرم میں گرفتار کر لیا اور سزا کے طور پر ایک ہاتھ قلم کر دیا۔ آپ وہ تر شاہوا ہاتھ اٹھا کر گھر لے آئے۔ اسے سامنے رکھ کر رویا کرتے تھے کہ اسے ہاتھ تونے طمع کی اور تونے سوا کیا، سو تونے اپنا انجام دیکھا۔" (۱۷)

افسانہ زرد کتا ۱۹۶۲ء میں لکھا گیا اس کا سیاسی، تہذیبی اور ادبی پس منظر ہے۔ سیاسی پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء میں ایوب خانی آمریت تھی۔ اور اسی آمریت کے زیر سایہ رائٹرز گلڈ وجود میں آیا اور تیسری بات یہ ہے کہ بیشتر ادیب نفس پرست ہو گئے۔ گویا یہ افسانہ فرد کے اخلاقی اور روحانی زوال کی کہانی ہے۔

انتظار حسین رقم طراز ہیں:

"پرانے زمانے میں ایک بادشاہ بہت سخی مشہور تھا۔ ایک روز اس کے دربار میں ایک شخص جو کہ دانشمند جانا جاتا تھا، حاضر ہو کر عرض پرواز ہوا کہ جہاں پناہ دانشمندوں کی بھی قدر چاہیے۔ بادشاہ نے اسے خلعت اور ساٹھ اشرفیاں دے کر بصد عزت رخصت کیا۔ اس خبر نے اشتہار پایا۔" (۱۸)

اس افسانے میں صوفیاء کے ملفوظات کا اسلوب اپنایا گیا ہے۔ جگہ جگہ حکایات کے درمیان تعلیمات شیخ مختلف مسائل کی صورت میں نظر آتی ہیں اور پھر جا بجا ان مسائل کی تفاسیر میں محض یہی نہیں افسانے کو غور سے پڑھنے سے اس کے تانے بانے میں کچھ داستانوں کے بیانیہ کا اسلوب بھی نظر آتا ہے۔

زرد کتا کا مرکزی کردار شیخ عثمان کبوتر حرص اور خوف کی نفی کی علامت ہے۔ اس کی پرواز حرص اور خوف سے پاک باطن کی وجدانی و تخیلاتی بلندی کی علامت ہے۔ وہ زندگی اور موت دونوں پر قدرت رکھتا ہے۔ جب تک چاہا زندہ رہا اور جب چاہا سر اینٹ پر رکھ کر چادر تان لی اور سو گیا۔ اس تمثیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حرص سے خوف مرگ پیدا ہوتا ہے اور اس خوف سے زندگی کی آلائشوں میں پھنس جاتا ہے. انتظار حسین رقم طراز ہیں:

"یا شیخ زرد کتا کیا ہے؟ فرمایا: "زرد کتا تیرا نفس ہے۔" میں نے پوچھا، "یا شیخ نفس کیا ہے۔۔۔؟" فرمایا، "نفس طمع دنیا ہے۔" میں نے استفسار کیا: یا شیخ طمع دنیا کیا ہے؟" فرمایا، طمع دنیا پستی ہے۔"

میں نے استفسار کیا، ''یا شیخ پستی کیا ہے ؟''فرمایا، ''پستی علم کا فقدان ہے۔''میں میتھی ہوا، یا شیخ علم کا فقدان کیا ہے ؟''فرمایا،"دانشمندوں کی بہتات(۱۹)

انتظار حسین کے نزدیک بدی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان گویائی ترک کر دیں تو پھر گدھوں کو قوت گویائی مل جائے گی اور انسان سماعت سے محروم ہو جائیں گے ، تو درخت اور قبریں میں پڑے مردوں کو سماعت مل جاتی ہے۔انسان انسان کے اس مرتبے پر گویائی اور سماعت کی وجہ سے ہی اشرف المخلوقات ہے ،اگر کلام کرنے والا اور سامع دونوں ہوس کے اسیر ہو جائیں تو ایک کلام کی تاثیر سے اور دوسر اسماعت سے محروم ہو جائے گا۔انتظار حسین رقم طراز ہیں:

"عاقل وزیر تب یوں گویا ہوا کہ "اے آقائے ولی نعمت، گدھوں اور دانشمندوں کی ایک مثال ہے کہ جہاں سب گدھے ہو جائیں وہاں کوئی گدھا نہیں ہوتا اور جہاں سب دانشمند بن جائیں وہاں کوئی دانشمند نہیں رہتا۔(۲۰)

انتظار حسین ایک حقیقی فنکار ہے۔وہ علامتوں کے پورے معیناتی نظام سے نہ صرف واقف ہے بلکہ وہ ان کے سلیقے سے استعمال کرنے کا شعور بھی رکھتا ہے۔اس لیے اردو افسانوی ادب میں ان کے اسلوب سے زبان کا ایک تخلیقی لہجہ پیدا ہوا ہے۔افسانہ ایک مرید کے خیالات، جدوجہد اور عمل پر مبنی ہے۔افسانے کے پہلے حصے میں مرشد، جس کا نام شیخ عثمان کبوتر ہے۔اس کے اور مرید کے درمیاں ہونے والی گفتگو کے ذریعے علم کی نوعیت کی وضاحت پیش کی گئی ہے۔انتظار حسین رقم طراز ہیں:

"یہ حکایت میں نے سنی اور سوال کیا، ''اشیخ عالم کی پہچان کیا ہے ؟''فرمایا، ''اس میں طمع نہ ہو۔''عرض کیا، طمع دنیا کب پیدا ہوتی ہے ؟''فرمایا، ''جب علم گھٹ جائے۔''عرض کیا، ''علم کب گھٹتا ہے۔''فرمایا، جب درویش سوال کرے، شاعر غرض رکھے، دیوانہ ہوش مند ہو جائے۔عالمتاجر بن جائے، دانشمند منافع کمائے۔''(۲۱)

شیخ کے نزدیک علم انسانوں کو شہرت، مرتبہ یا دولت نہیں دے گا۔اس کی بجائے علم انسانوں کو ضبط نفس کی ضرورت، قربانی و شفاعت کی حسن وزیبائی اور پرہیزگاری کا راستہ دکھاتے ہوئے جہالت، نفاق اور شک سے انسانوں کو آزاد کر دیتی ہے۔شیخ مرید کو ایک حکایت کے ذریعے اس بات سے خبردار کرتے ہیں کہ کوئی کتنا ہی عقلمند ہو، خواہ درویش ہو، شاعر ہو، عالم وغیرہ ہو، دنیاوی رغبت سے باز نہیں آسکتا۔مرکزی کردار کے علاوہ سید رضی، ابو مسلم بغدادی، شیخ حمزہ، ابو جعفر شیرازی وغیرہ شیخ کے پاس دوسرے مریدین تھے۔انہوں نے ابتدا ہی سے انسانی رنج اور درد کی نشاندہی کرنے کے حوالے سے مرشد کی ہوشمندی کی تعریف کی۔انتظار حسین رقم طراز ہیں:

"پھر میں نے ابو مسلم بغدادی کا پتہ لیا۔ایک شخص نے مجھے قاضی شہر کی محل سرائے کے سامنے جا کھڑا کیا اور کہا کہ ابو مسلم بغدادی کا مسکن یہی ہے۔میں نے اس محل سرائے کو دیکھا۔اپنے تئیں حیران ہوا کہ ابو مسلم بغدادی نے مرتبہ لے لیا۔(۲۲)

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم جتنا اپنی خواہشات و آرزوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔اتنا ہی زیادہ اپنی ناپاک خواہشات کا شکار ہوتے ہیں، جیسے کہ مرید کتنا ہی سختی سے زرد کتے کو ٹھوکر مارے اور روندے کتا اتنا ہی اسے ستاتا رہے گا۔آرزوں اور رخواہشات سے نجات حاصل کرنا بھی

ایک اور قسم کی خواہش ہے۔ یہ پوشیدہ لیکن گہرا پیغام ہے جس پر افسانے کے اختتام پر زور دیا گیا ہے۔

سیکنڈ راؤنڈ:

سیکنڈ راؤنڈ بھی ایسا افسانہ ہے۔ جو اسی جنگ کا بیانیہ ہے۔ جنگ میں توپ و تفنگ اور مومنوں و کافروں، حق و باطل کی بجائے افسانہ نگار انسانی نفسیات کو سامنے رکھے ہوئے ہے مایوسی، کم ہمتی، وسوسے، اندیشے ہیں کہ قاری کو گھیر لیتے ہیں اور تاریخ کے ایسے دوراہے پر اپنے آپ کو کھڑا محسوس کرتا ہے جہاں اندھیرا ہے۔

انتظار اس افسانے میں یوں تحریر کرتے ہیں ؛

"بھی ابھی بڑے ابا نے دیوان حافظ سے فال لی تھی اور اعلان کیا تھا کہ جنگ ہو گی۔ آگے کیا ہو گا۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے "وہ میں بتاتا ہوں، چچا میاں کہ اب تک کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ضرور بتاؤ" بڑے ابا نے دیوان حافظ بند کر کے ایک طرف رکھا اور عینک اتار کر کیس میں رکھنے لگے۔ بس شمالی ہند پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔(۲۳)

اس مجموعے کی ترتیب میں افسانہ نگار نے شعوری کوشش سے ایسے افسانے رکھے ہیں جن میں اخلاقی تصور موجود ہیں۔ ان کی فضاء قرآنی قصص اور بائبل کی حکایات والی ہیں۔ اس کے باوجود اس میں ہندوستان پاکستان کی ارضی صورتحال سے مناسب ہیں۔ کہانی کے تانا بانا میں کہیں مشکل ہے۔ تو اس میں قصور انتظار حسین کا نہیں قاری کا ہے۔ کہ وہ اپنی استعداد مطالعہ کو وسیع کرے۔ اس مجموعے کا آخری افسانہ اپنے کرداروں کے بارے میں ہے۔ وہ کہتے ہیں افسانے میں میرا مسئلہ ظاہر نہیں ہوتا چھپا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پیغمبروں اور لکھنے والوں کا اپنے قارئین سے رشتہ دوستی کا بھی ہوتا ہے اور دشمنی کا بھی۔ وہ ان کے درمیان دینا بھی چاہتے ہیں اور ان کے دشمن نظروں سے بچنا بھی چاہتے ہیں۔ وہ افسانہ لکھنے کو اپنی ذات سے ہجرت کا عمل قرار دیتے ہیں اور ہجرت کو جان کی آفت بھی سمجھتے ہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے درخت میں پناہ لی پگڑی کا سر باہر رہ گیا دشمنوں نے درخت سمیت دونوں کو آدھا کر دیا۔ انتظار حسین نے ایسے کردار تراشے ہیں جو انسان کو فقط انسان کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں وہ نسلی تفاخر قومی گھمنڈ اور مذہبی منافرت سے کوسوں دور ہیں۔ کیوں کہ یہ وہ برائیاں ہیں جو انسان سے اس کا مقام چھین لیتی ہیں۔

ٹانگیں: ٹانگیں کی فضا سفر کی ہے "زرد کتا" کی طرح اس میں کہانی مکالمے کے ذریعے معنی کی گئی ہے مکالمہ تانگہ چلانے والے یاسین، تانگے کی کچھ سواریوں اور سید صاحب کے درمیان رونما ہوتا ہے۔ کہانی کا کلیدی جملہ جو چھوٹتے ہی سامنے آتا ہے، یہ ہے۔

"آدمی سالے کا کوئی اعتبار ہے!'' شام کی پر اسرار فضا میں گفتگو کے دوران یاسین ایک کے بعد ایک اپنے تجربات اور عقائد بیان کرتا ہے، داتا دربار، علی بن عثمان جلابی، کشف المحجوب اور وہ فقیر جس نے کہا اے فلانے اب مر جانا چاہیے اور مر گیا۔ یاسین اچھرے کی زنانی سواری کو سخت بے اعتنائی سے جواب دیتا ہے اور اسے نہیں بٹھاتا. وہ چھل پائیوں کا ذکر کرتا ہے سید صاب عورت اتنی خوبصورت کہ میرا دل یوں یوں کرے، پر میری نظر ایک ساتھ اس کے پیروں پر جا پڑی، میرا جی سن سے نکل گیا۔ یاسین نے عورت کا بال توڑا اور اسے قابو میں کر لیا۔ لیکن

ایک رات گھنے پیڑ کے نیچے دھم سے ایک مسٹنڈا نچے کودا، اور رات بھر لڑائی ہوتی رہی۔ یاسین حیران کہ مسٹنڈا لمبا ہو رہا ہے۔ لمبا ہوتے ہوتے اس کا سر درخت کی سب سے اوپر والی پھنگ سے جالگا اور یاسین اس کی ٹانگوں سے لپیٹا رہ گیا۔ ٹانگیں اس کی بکرے جیسی تھیں سفر کے دوران یاسین کئی سواریوں کو انکار کرتا ہے، ایک دو کو بٹھاتا ہے پھر کہتا ہے سید صاب زمانہ بہت برا آگیا ہے میکلوڈ روڈ پر کھڑا تھا۔ ایک جنٹلمین سوٹ بوٹ ڈانٹے آیا۔ میں نے کہا لے بھئی یاسین سواری مل گئی مگر جی وہ چپکے سے بولا، مال ملے گا۔ میں بہت کھسیانا ہوا۔ یاسین بی اماں کی تنبیہ کا ذکر کرتا ہے کہ چودھویں صدی میں گائے گوبر کھائے گی اور بیٹی بر مانگے گی، پر جی اب تو اس سے بھی زیادہ ہو گئی۔(۲۴)

انتظار حسین اس افسانے میں یوں تحریر کرتے ہیں:

"پرسوں رات میں بیڈن کے اڈے پر کھڑا تھا۔ کیا دیکھوں ہوں کہ حرامی بوندی کے تانگہ میں ایک لونڈیا بیٹھی ہے۔ بوندی سالا بہت حرامی ہے ہیں جی اس لونڈیا کو جانے تھا۔ میں اسے کئی مرتبے کالج پہنچا کے آیا تھا، پر وہ تانگہ میں بھی تھی، سید صاحب میں مر گیا... اور اس فقیر نے مصلے پہ لیٹ، آنکھیں بند کر اعلان کیا کہ میں مر گیا، اور وہ مر گیا۔(۲۵)

انتظار حسین رقم طراز ہیں:

"سفر کے خاتمے پر سید صاحب یاسین سے پوچھتے ہیں کہ میکلوڈ والی سواری نے جو سوال کیا تھا اور جس پر یاسین نے اس کو اتار دیا تھا، اگر وہی سوال سید صاحب کریں تو یاسین وم لے کر کہتا ہے " نہیں سید صاحب آپ ایسا نہیں کہیں گے نہیں سید صاحب آپ مت کیسے ایسا" سید صاحب کے کانوں میں یہ جملہ بہت دیر تک گونجتا رہتا۔"(۲۶)

سید صاحب آپ نہیں کہیں گے اور پھر یاسین کا یہ کہنا کہ آدمی سالا کیا چیز ہے کچھ پتا نہیں چلتا کون کیا ہے۔ آپ کو کیا پتا کہ میں کون ہوں، اور جی مجھے کیا پتا آپ کون ہیں۔ اس کہانی میں بھی انتظار حسین یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ وجود کیا ہے، اور کیا نہیں ہے سوال یہ ہے کہ میں ہوں یا میں نہیں ہوں؟ سوال یہ ہے کہ میں ہوں تو کیوں ہوں، اور نہیں ہوں تو کیسے نہیں ہوں اور سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی ہوا اور پھر نہ ہوا۔ کہانی کا مرکزی موضوع انسان کی اخلاقی گراوٹ ہے۔ انتظار حسین کہتے ہیں: آدمی جب گرتا ہے تو اسے مطلق اطلاع نہیں ہوتی کہ وہ گر گیا ہے۔ اور سب لوگوں کے کہنے سننے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گر گیا ہے لیکن اسے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیوں کر گرا تھا وہ لاکھ اپنی گری ہوئی حالت کو دھیان میں لانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ بس یوں لگتا ہے جیسے وہ ان لمحوں میں تھا ہی نہیں جیسے وہ تھا اور پھر نہیں رہا تھا اور اب پھر ہے انتظار حسین کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے سارے وجود کو یعنی شعور اور لاشعور، حافظے وعقیدے اور تجربے و مشاہدے کو تخلیقی نقطے پر مرتکز کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی پوری فکر کے ساتھ وجود کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ ان یادوں اور خوابوں کو واپس لانے کی سعی کرتے ہیں جو ماضی میں انسان کی مسرتوں اور اس کی خوشیوں میں بسے ہوئے تھے اور عہد حاضر کی یلغار میں یکایک غائب ہو گئے۔ وہ ان یادوں کو کھیل کے میدانوں سے بھاگے ہوئے بچوں کی طرح پکڑ پکڑ کر لاتے ہیں اور سب جمع ہو کر دھما چوکڑی مچاتے ہیں۔

سوت کے تار:

سوت کے تار‘‘میں پاک بھارت جنگ کا حوالہ ہے۔قرآن مجید کی ایک آیت کاذکر بار بار آیاہے کہ ایک عورت محنت مشقت سے سوت کاتی ہے پھر خود ہی ادھیڑ دیتی ہے۔اس تمثیل سے اپنا آپ نقصان کرنے والوں کا بیان ہے۔بصارت سے محروم بتی،اندھیری رات، تباہ مکان جیسی علامتیں دوراندیشی کے فقدان، ظلم وجبر اور بربادی کو سامنے لاتی ہیں۔یہاں بھی سوٹ بوٹ والا آدمی، ملاں پنواڑی، سکوٹر والا، بے نام ہیرو اور نوجوان جیسے کردار ہیں۔جو مغربی مقلد، مڈل کلاس کے لوگ اور عام آدمیوں کے نمائندہ ہیں۔بے نام کردار جو کسی وصف سے اپنی پہچان کرواتے ہیں، وہ سب علامتی ہیں

References

1. Arnold Toynbee, *Study of History*, Lahore: Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, 2013, p. 33
2. Gopi Chand Narang, *After Modernism*, Lahore: Sang-e-Meel Publishers, 2006, pp. 228–229
3. Dr. Sadiq Ali, *Art of Historiography*, Lahore: From Homer to Toynbee, 1998, p. 17
4. Dr. Gustav Le Bon, translated by Syed Ali Bagrami, *Civilization of India*, Lahore: Maqbool Academy, 1962, p. 381
5. Intizar Hussain, *Sheherzad ke Naam*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2002, p. 103
6. Intizar Hussain, *Zawal-e-Alamaton* (The Decline of Symbols), Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2009, p. 13
7. Prof. Wahab Ashrafi, *Tareekh-e-Adab-e-Urdu*, Volume III, Delhi: Educational Publishing House, p. 131
8. Intizar Hussain, *Gini Chuni Kahaniyan*, “Kata Hua Dhiya” (Short Story), New Delhi: Vikas Publishing House, p. 91
9. Intizar Hussain, *Gini Chuni Kahaniyan*, “Mehal Wale” (Short Story), New Delhi: Vikas Publishing House, p. 96
10. Muhammad Hasan, *Modern Urdu Literature*, New Delhi: Maktaba Jamia Limited, 1975, p. 28
11. Intizar Hussain, *Aakhri Aadmi* (The Last Man), Delhi: Educational Publishing House, 1993, p. 19
12. Ibid.
13. Intizar Hussain, *Aakhri Aadmi*, Delhi: Educational Publishing House, 1993, p. 18
14. Intizar Hussain, *Aakhri Aadmi*, Delhi: Educational Publishing House, 1993, p. 20
15. Intizar Hussain, *Aakhri Aadmi*, Delhi: Educational Publishing House, 1993, pp. 22–23
16. Intizar Hussain, *Aakhri Aadmi*, Delhi: Educational Publishing House, 1993, p. 26
17. Ibid.
18. Intizar Hussain, *Aakhri Aadmi*, Delhi: Educational Publishing House, 1993, p. 29
19. Ibid.
20. Intizar Hussain, *Aakhri Aadmi*, Delhi: Educational Publishing House, 1993, p. 30
21. Ibid.
22. Intizar Hussain, *Aakhri Aadmi*, Delhi: Educational Publishing House, 1993, p. 24
23. Intizar Hussain, *Aakhri Aadmi*, Delhi: Educational Publishing House, 1993, p. 107
24. Intizar Hussain, *Aakhri Aadmi*, Delhi: Educational Publishing House, 1993, p. 90
25. Intizar Hussain, *Aakhri Aadmi*, Delhi: Educational Publishing House, 1993, pp. 56–57